تحریکِ سوشلزم پر ایک تنقیدی نظر

از جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی ایم۔ اے

(۲)

سب سے پہلے پیداوار دولت کی کارگذاری کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ تجارتی مقابلہ کا دستور حد درجہ ناکامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ انفرادی خود غرضی اور نفع کے لالچ پر جماعت کی ضروریات فراہم کرنے کا دارومدار بالکل غلط طریقہ ہے۔ ذاتی نفع کا اجتماعی مفاد سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ پروفیسر Veblen عہد جدید کی اقتصادی زندگی کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔

"جہاں کہیں بھی تجارت کا موجودہ طریق عمل اور اُس کے مقاصد جدید انڈسٹری پر حاوی ہیں وہاں کام کے حقیقۃً نفع بخش ہونے اور اُس کی مزدوری میں نسبت دور کی ہے۔ یہاں تک کہ اس نسبت پر غور کرنا فضول سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کام جماعت کے لیے غیر مفید یا مضر ہو وہ تاجر اور مزدور کے لیے نفع بخش ثابت ہو سکتا ہے"

بہت سے کام جو اپنے افادے کے اعتبار سے نہایت اہم اور ضروری ہوتے ہیں، وہ ذاتی یا شخصی تصرف یا قبضہ میں نہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیے جاتے۔ مثلاً جنگلات کا قیام اور ان کی حفاظت آب و ہوا کو مرطوب رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ کیونکہ آب و ہوا یا بارش ایسی چیز نہیں کہ اسے ایک گٹھری میں باندھ کر ادھر سے اُدھر پہنچایا جا سکے۔ لیکن ہمارے جنگلات کو کلہاڑیوں اور آگ سے برباد کیا جا رہا ہے۔ اسی طرح یہ ممکن ہے کہ کسی چٹان کے قریب روشنی کا رہنما منارہ قطعاً ضروری اور مفید ہو۔

لیکن طلب نفع کی ہوس ایسی جگہ اس قسم کے منارہ کی تعمیر میں مزاحم ہوگی جہاں حالات ایسے ہوں کہ جہازوں سے ٹیکس وصول نہ کیا جاسکتا ہو، چنانچہ Fourier لکھتا ہے۔

"ہم پانی اور جنگلات کے معاملہ میں بالکل وحشی ہیں ... ہم ہیں تکلیں نہیں کرتے کہ ان کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں، بلکہ اُسے کلہاڑیوں سے برباد کیے دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگل اور پہاڑ ویران ہو جائینگے، اور ساتھ ہی اس قطعہ زمین کی آب و ہوا بھی خراب ہو جائیگی۔ ہماری آئندہ نسلیں ہمیں کیا دعائیں دینگی جبکہ وہ پہاڑوں اور جنگلوں کو برباد دیکھینگی"۔

نقصان کا احتمال اس حالت میں بہت زیادہ ہے جبکہ طلب نفع کی کشش کام کرنے والوں یا تاجروں کی ایک بڑی تعداد کو ایک خاص کام میں مصروف و مشغول رکھتی ہے۔ موجودہ زمانہ میں سنڈیکیٹ اور ٹرسٹ کے قیام نے پبلک پر یہ ثابت کر دیا کہ دستور مقابلہ میں بہت روپیہ اور وقت ضائع ہوتا ہے۔ بیچ کے بیوپاری کا وجود بھی موجودہ نظامِ تجارت کی ایک بڑی تیغ ہے۔

Fourier اسی تجارتی مقابلہ کے متعلق تحریر کرتا ہے:۔

"ہم انڈسٹریل نظام کے مقابلہ میں اس قدر پیچھے ہیں جیسے کہ وہ قوم جو آٹا پیسنے کی برقی چکی سے ناواقف ہو اور اناج پیسنے کے لیے بیس مزدور لگائے حالانکہ وہ اتنی ہی مقدار ایک برقی چکی سے آسانی سے تھوڑے وقفہ میں پیس سکتے ہیں۔ اسی طرح ایجنٹوں کی کثرت بھی ضرورت سے چوگنی زائد ہے"

دستور مقابلہ کے نقص یا خرابی کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ ہم ایک گلی یا محلہ میں دودھ کی سپلائی کے انتظام پر غور کریں۔ یعنی ایک صورت تو یہ ہے کہ بیسیوں دوکاندار یا دودھ والے جو ایک دوسرے کا مقابلہ کر رہے ہیں، اس گلی یا محلہ میں بغیر کسی نظام کے سپلائی کرتے ہیں۔ اور اُس کے مقابلہ

میں دوسری صورت ڈاک کی تقسیم کی ہے جو ایک مرکز سے ہوتی ہے۔ غور کیجیے کہ دودھ ایک گلی یا محلہ میں کس طرح سپلائی کیا جاتا ہے۔ صبح چھ بجے ایک دودھ والا آتا ہے، اور ایک گھر میں دودھ دے کر چلا جاتا ہے۔ پندرہ یا بیس منٹ بعد دوسرا دودھ والا آتا ہے گلی کے ایک طرف اور پھر دوسری طرف کل سات گھروں میں دودھ دے کر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک دو گھنٹے کے عرصہ میں چار پانچ دودھ والے مختلف وقفوں کے بعد آتے ہیں۔ اور اکا دکا گھروں میں دودھ دے کر چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ بازار سے دودھ لے آتے ہیں۔ غرض تمام محلہ کو دودھ سپلائی کرتے کرتے کافی دن ڈھل جاتا ہے۔ جب کہیں دودھ کی سپلائی کا کام ختم ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ڈاک کی تقسیم جس عمدگی اور کم سے کم وقت میں ہوتی ہے اس کا آپ کو خود علم ہے خاص کر پبلک افادہ کے ان کاموں میں جہاں نفع کی زیادتی ہوتی ہے وہاں دستور مقابلہ کے سبب بہت سا وقت اور روپیہ فضول ضائع ہوتا ہے۔

مقابلہ پر بیچنے کی وجہ سے پیداوار کی قیمت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ جو موجودہ اشتہار بازی کے دور میں ہر ایک کی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض اوقات اشتہار پبلک کے لیے رہنما اور مفید ثابت ہوتا ہے لیکن زیادہ تر اشتہار بازی محض مقابلہ کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ مثلاً ٹوپی بنانے والا دوسرے سے بہتر ٹوپی بنانے کی کوشش کرنے کی بجائے ایک بہت بڑی گتے اور پلاسٹر کی ٹوپی بنوا کر جو ٹھیلے کے پہیوں سے تقریباً سات فٹ اونچی ہو، ایک آدمی کے ذریعہ بازاروں میں پھرواتا ہے اور اُمید کرتا ہے کہ اس طرح اس کی دکانداری بڑھ جائیگی۔ اس نے بہتر ٹوپیاں بنانے کی ہمت نہیں کی جیسا کہ اسے کرنا چاہیے تھا، اور شاید وہ اپنے ساتھی دکاندار سے بہتر بنا سکتا تھا۔ اس کی بجائے اس کی ساری کوشش و محنت اس بات پر صرف ہوتی ہے کہ وہ ہمیں کسی نہ کسی طرح یہ یقین دلا دے کہ وہی سب سے بہتر ٹوپی بناتا ہے۔ وہ بھی خوب اچھی طرح جان گیا ہے کہ مکر و فریب ہی آج تجارت کا دیوتا ہے۔ اس قسم کی اشتہار بازی سے فروختگی میں اضافہ ضرور ہوتا ہے لیکن وہ صرف دوکاندار کے لیے نفع بخش

ہے نہ کہ عام خریدار کے لیے چنانچہ Jenks اپنی کتاب The Trust Problem میں لکھتا ہے:-

"اشتہار بازی کے اس قسم کے اخراجات خریدنے والے کے لیے مال کی قیمت بہت بڑھا دیتے ہیں۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا، کہ بہت سی چیزوں میں اگر مقابلہ کی اشتہار بازی کو بند کر دیا جائے تو خریداروں کے لیے اُن کی مرضی کے مطابق اتنا ہی اچھا مال موجودہ قیمت کے مقابلہ میں آدھی قیمت پر ملنا ممکن ہے۔ اور اس کے باوجود بنانے والوں کو اتنا ہی زیادہ نفع مل سکتا ہے جتنا کہ اب ملتا ہے۔

ہماری قوت، محنت اور روپیہ زیادہ تر ایسی مد میں صرف ہوتا ہے جس سے سوسائٹی کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ اس کے علاوہ فضول خرچی اور طرح پر بھی ہوتی ہے، مثلاً کلکتہ کا بنانے والا اپنا مال پشاور میں فروخت کرے اور پشاور کا بنانے والا ویسا ہی مال کلکتہ میں فروخت کرے جس کی وجہ ادھر سے اُدھر مال کے جانے کا کرایہ بھی مال کی قیمت میں شامل ہوتا ہے۔ اسی طرح اور دیگر اخراجات فضول طریقے پر ہوتے ہیں جن کی تفصیل یہاں پیش نہیں کی جا سکتی۔

الزام کو جاری رکھتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ نظام سرمایہ داری کو جیسی کھلی ناکامیابی طلب و رسد کے توازن قائم رکھنے میں ہوئی ہے۔ وہ کسی جگہ نہیں ہوئی۔ ایسی جماعت میں جہاں مقابلہ کا دستور رائج ہو۔ وہاں پیداوار دولت بے نظم و بے ترتیب طریقے پر ہوتی ہے۔ اٹکل پچو منتشر صورت میں مال تیار کرنے والے تمام دنیا کے خریداروں کی طلب کے لیے جس کا انحصار محض اندازے پر ہوتا ہے، مال تیار کرتے ہیں مال کی تیاری میں ترتیب و انضباط کا کوئی خیال نہیں کیا جاتا۔ بعض اوقات ان کے اندازے میں فحش غلطی ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی مال کی کمی یا زیادتی سے تمام بازار میں ہلچل مچ جاتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تجارت بند ہو جاتی ہے۔ مارکیٹ میں مال نہیں ہوتا، نقد روپے میں کمی ہو جاتی ہے، کارخانے بند کرنے پڑتے ہیں۔ اور مزدوروں کی کثیر تعداد بے کار ہونے کی وجہ سے کھانے کو ما نگتی ہے۔

اسی طرح اگر ہم مال کی مقدار یا تعداد سے قطع نظر کرکے اس کی خوبی یا نوعیت پر غور کرتے ہیں تب بھی دستور مقابلہ اس معاملہ میں کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا چنانچہ John Bright کہتا ہے "کھوٹ اور جعلسازی بھی دستور مقابلہ کی ایک پھلی صورت ہے" فطری معصیت اور سائنس کی ترقی کی بدولت روزانہ استعمال کی چیزوں میں سے ہر ایک چیز کا جعلی یا مصنوعی طور پر بنا لینا آسان ہوگیا ہے اور اس وجہ سے اور بھی آسان ہے کیونکہ عام خریدار کو اس کا کوئی تجربہ یا علم نہیں ہوتا کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ کرکے نفع کمانا بہت آسان ہے۔ کیونکہ عام خریدار کی ذہنیت اور واقفیت بہت کم درجہ کی ہوتی ہے۔ پہلے زمانہ میں بھی اس قسم کی دھوکہ بازی ہوا کرتی تھی لیکن وہ آج کل کی کھوٹ اور ملاوٹ کے سامنے پانی بھی نہیں بھر سکتی۔ جس صفائی سے آج کل معمولی سے معمولی کھانے پینے اور دیگر استعمالی اشیا میں دھوکا دیا جاسکتا ہے، وہ اچھے اچھے نقاد بھی نہیں پہچان سکتے۔

اور صرف روزانہ استعمال کی چیزوں ہی میں اس جعلسازی اور دھوکہ بازی کا بازار گرم نہیں ہے بلکہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں ایسے پیوند لگانے والے ماہرین موجود ہیں۔ جہاں کہیں بھی بغیر دیے کچھ حاصل ہوسکتا ہے۔ یا کسی ایسے ویسے مقابلہ میں غیر معمولی فائدہ ہوسکتا ہے۔ یا یوں سمجھیے کہ جہاں کہیں بھی بیچ کے پردے میں خدمت خلق کے بہانے جھوٹ کامیاب ہوسکتا ہے۔ وہاں یہ پیوند لگانے والے اپنی کسر نہیں چھوڑتے۔ چنانچہ قرضہ کی انجمنیں، جھوٹے دوا فروش یا حکیم، ڈاکٹر، دھوکہ باز وکیل، قسط پر مال دینے والی دکانیں۔ جھوٹی سند تقسیم کرنے والی یونیورسٹیاں اسی زمرے میں شامل ہیں۔

اگر مال ذرا دیانت سے تیار کیا جاتا ہے، تو وہ اتنا خوبصورت اور دلکش نہیں ہوتا۔ کاریگر کو اپنے کام میں پورے پورے انہماک کی بجائے مالک کے بہی کھاتے کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہی حالت ان دوکانداروں کی ہے جن کی دکانوں میں مال ایک دوسرے پر اٹا ہوا پڑا ہے۔ ہر چیز میں روپیہ اور

نفع کا خیال پیش پیش ہے۔ صرف نفع لانے والی چیزوں کو قرینے سے سجایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کسی بات کا خیال نہیں رکھا جاتا۔

یہی حال لیمیٹڈ کمپنیوں کا ہے۔ کہ وہ سادہ لوح انسانوں کو نفع کا لالچ دے کر ان سے روپیہ وصول کرتی ہیں، پھر دھوکے اور فریب سے ان کا روپیہ غبن کر جاتی ہیں۔ اور اپنی صفائی پیش کرنے کو کمپنی کے بہی کھاتے کھول کر رکھ دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ کامیاب کمپنیاں بھی پبلک مفاد کا کوئی خیال نہیں کرتیں۔ بلکہ انہیں اپنے سرمایہ اور نفع کے علاوہ اور کسی شے سے سروکار نہیں۔ ان کا اثر مجلس قانون اور میونسپلٹیوں پر ہوتا ہے۔ جس کے ذریعہ وہ وہاں بھی خرابیاں پیدا کر کے پبلک کا سر مونڈتے ہیں۔ ان میں اور جوئے خانوں کے مالک یا دھوکے بازوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہ سب دیانت کے اصول سے ہٹ کر کام کرتے ہیں۔

مقابلہ کے دستور کے نقائص بیان کرنے کے بعد سوشلسٹ یہ سوال کرتے ہیں جو لوگ یہ تمام دولت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی حالت کیا ہے؟ ان کا اس نفع یا پیداوار میں کیا حصّہ ہے؟ ان کی بہبودی اور مادی آسائش و آرام کا کہاں تک خیال کیا جاتا ہے؟ یہ وہ مقام ہے جہاں سوشلسٹ موجودہ نظام کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیتا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت کے لیے دستور مقابلہ اور سرمایہ داری مفلسی اور مصائب کا جال بچھا رہی ہے۔ غریب لوگوں کو ساری عمر بھوک، جہالت، قبل از وقت موت، اور تکلیف دہ بڑھاپے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ جبکہ انگلینڈ کو خوشحال سمجھا جاتا تھا۔ اس وقت John Ball نے ایک لارڈ اور کاشتکار کی زندگی کا مقابلہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"انگلینڈ کی حالت آج کل اچھی نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ اس وقت تک سدھر سکتی ہے۔
جب تک کہ ہر شے مشترکہ نہ ہو۔ اور کاشتکار اور لارڈ کا درمیانی امتیاز مٹا نہ دیا جائے۔ ہم

سب متحد اور ایک ہوں۔ لارڈ ہمارے اوپر حاوی یا مالک نہ ہوں۔ ہم نے ایسا کونسا قصور کیا ہے جو ہمیں اس طرح غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے۔ ہم سب ایک آدم اور حوا کی اولاد ہیں۔ وہ کس طرح یہ کہہ سکتے یا ثابت کرسکتے ہیں کہ ہم سے بڑے ہیں سوائے اس کے کہ وہ ہم سب سے محنت کراتے ہیں اور اس کا پھل خود کھاتے ہیں۔ وہ ریشمین اور مخملی لباس زیب تن کرتے ہیں، اور ہم موٹے جھوٹے پر قناعت کرتے ہیں۔ ان کے دسترخوان لذیذ ترین کھانوں سے چنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور ہم سوکھی روٹی اور پانی پر گذارا کرتے ہیں۔ وہ اعلیٰ درجہ کے مکانوں میں رہتے ہیں، اور ہمیں کھلے میدانوں میں محنت، ہوا اور بارش کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ ہماری ہی محنت کی بدولت وہ اپنی جاگیریں اور جائدادیں قائم رکھتے ہیں، اور ہم ہی اُن کے غلام کہلاتے ہیں حالانکہ ہمارے بغیر ان کا کوئی کام نہیں چل سکتا"

اور آج اتنا عرصہ گذرنے پر بھی تمدن اور تہذیب کی ترقی کے اس دور میں جبکہ سیاسی آزادی اور انڈسٹریل انقلاب کا دور دورہ ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے نزدیک موجودہ سوسائٹی کے دستور کو بھی ایک ترقی یافتہ غلامی کے دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یعنی نوّے فیصدی اصلی دولت پیدا کرنے والے بے گھر ہیں۔ مہینے کا کرایہ ادا کیے بغیر وہ ان مکانوں کو اپنا نہیں کہہ سکتے۔ وہ کسی قطعۂ زمین کے مالک نہیں ہیں۔ ان کے گھر کا سامان کل اتنا ہوتا ہے جو بآسانی ایک ٹھیلے پر لادا جاسکتا ہے ان کی روزانہ مزدوری اتنی کافی نہیں ہوتی کہ وہ صحت قائم رکھ سکیں۔ اور اب تو اس کے بھی لالے ہیں۔ اکثر ان کی رہائش ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں امرا اپنے گھوڑوں کو بھی باندھنا پسند نہ کریں۔ ان کی مالی حالت اس قدر نازک اور خطرناک ہے کہ ایک مہینے یا چند روز کی مزدوری کے غیر متوقع طور پر بند ہو جانے سے انہیں بھوک اور افلاس کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جن حالات کے ماتحت لوگ اپنی معاش کماتے ہیں اُن پر غور کرتے ہوئے سوشلسٹ یہ دیکھتا ہے کہ اکثریت مزدوری کی غلامی میں مبتلا ہے۔ کام کے تمام مواقع اور حالات پر سرمایہ داری کا کنٹرول پہلے زمانہ کے غلاموں کے آقاؤں سے زیادہ تشدانہ ہے، اگرچہ آج کل کسی قانونی معاہدے کی رو سے مزدور اپنے مالک کے ماتحت کام کرنے پر مجبور نہیں ہے لیکن سرمایہ داروں کی گرفت تمام ذرائع معاش و زندگی کے اجارے دار ہونے کی حیثیت سے اس کاغذی معاہدے کی بہ نسبت زیادہ ہے۔ سب سے بڑا فرق پرانی اور نئی غلامی میں یہ ہے کہ جدید غلاموں کے گلہ بان پر اپنے غلاموں کو بھوک و فاقہ زدگی سے محفوظ رکھنے کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ یہ سرمایہ دار اور صرف سرمایہ دار کے ہاتھ میں ہے کہ کب اور کہاں کام شروع ہونا چاہیے، کس کو نوکر رکھا جائے اور کس کو نہیں۔ اور یہ کہ کام کرنے کا کیا طریقہ اختیار کیا جائے۔ *Keir Hardie* اپنی کتاب *From Serfdom to Socialism* (صفحہ ۵۲-۵۳ و ۶۶) میں لکھتا ہے:-

مزدور اس بات کو محسوس کر رہے ہیں کہ وہ قدیم غلامی کے طوق سے نکل کر دوسری قسم کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیے گئے ہیں۔ جس میں پہلے سے بھی زیادہ بھوک اور فاقہ کشی کا خطرہ ہے۔ نوکری پر اس کا کوئی حق نہیں ہے۔ کسی پر اسے نوکری دلانے کی ذمہ داری عائد نہیں۔ اور نہ ہی وہ خود کام شروع کرنے کے لیے آزاد ہے۔ کیونکہ اس کے پاس نہ مزدوری زمین ہے اور نہ سرمایہ، اس کی حالت خانہ بدوشوں کی سی ہے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ ایک اشارہ پر کسی خالی جگہ کام کرنے کو تیار رہتا ہے۔ وہ بھوکا رہے لیکن بُول نہیں سکتا، ننگا پھرے لیکن بُن نہیں سکتا، بے در ہو لیکن گھر نہیں بنا سکتا، اور کام کرنے کی صورت میں بھی اس کی کوئی آواز نہیں۔ کارخانے کے مقررہ قواعد کی پابندی لازم ہے اور نہ ہی اسے کام کے انتخاب یا طریق کار میں کوئی آزادی

حاصل ہے۔ اس کے فرض کی ابتدا و انتہا بجز امتثال امر کے اور کچھ نہیں ہے کام کے وقت اپنے ساتھی سے بات چیت کرنا یا گانا یا سیٹی بجانا منع ہے گھنٹی کی آواز کے ساتھ کارخانہ میں داخل ہوکر کام شروع کر دینا لازمی ہے۔ پھر اسی طرح دوسری گھنٹی پر اسے وقت مقررہ پر کھانے کا حکم دیا جاتا ہے، نہ وہ ان مشینوں کا مالک ہے جن پر وہ کام کرتا ہے نہ اس پیداوار میں اس کا کوئی حصہ ہے۔ جو دراصل اسی کی محنت کا پھل ہے۔ وہ ایک کرایہ کی چیز ہے اور اس سے خوش ہے جو اسے کرایہ پر لے لے"۔

جدید مزدور سے صرف اس کی آزادی ہی سلب نہیں کی جاتی بلکہ اس کام کی نوعیت جو وہ دوسرے کے حکم سے کرتا ہے ایسی یک رنگ ہوتی ہے کہ کام کرنے والا جلد اس سے اکتا جاتا ہے مزدور خود مشینوں کی طرح کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کی قدرت کی طرف سے ودیعت شدہ قوتیں تمام زائل ہو جاتی ہیں۔ انفرادیت منظم پیداوار کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھ جاتی ہے چنانچہ Hobson اپنی کتاب The Social Problem (صفحہ ۱۲-۱۱) میں تحریر کرتا ہے۔

"مزدور جماعت کی تمام کام کی طاقت کو کام کے خاص درجوں میں تقسیم کرتے وقت جب تک ان کی آزادی اور فرصت کا خیال نہ رکھا جائیگا اُس وقت تک اُن کی اخلاقی حالت درست نہیں ہوسکتی۔ ایسا نہ کرنے سے اس کے ذاتی ارتقا میں رکاوٹ پیدا ہوگی اور اس کی روح پژمردہ ہو جائیگی، روزانہ خاص قسم کا کام یکساں طور پر کرنے سے زندگی پر بھی مشین کے طریق عمل کا نفسیاتی اثر مرتب ہوتا ہے اور اس کی انفرادیت اور خودروی کے وہ عناصر زائل ہو جاتے ہیں جو زندگی کو معقول اور خوشگوار بنانے میں معاون ہوتے ہیں"

Adam Smith بھی اس سلسلہ میں لکھتا ہے۔

"وہ شخص جس کی تمام زندگی چند معمولی قسم کے مخصوص کام میں صرف ہو جاتی ہے، اور جس کا

نتیجہ بھی وہ ہر روز یکساں دیکھتا رہتا ہے، اس کو کبھی اپنی عقل کے صحیح استعمال کا موقع نہیں ملتا۔ اور اس کام کے علاوہ اسے کسی دوسری قسم کی مشکلات سے واسطہ نہ پڑنے کی صورت میں اس میں سے مادۂ ایجاد بھی زائل ہو جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آخر کار سمجھ سے کام لینے کی عادت بالکل چھوٹ جاتی ہے، اور وہ بے وقوف اور جاہل رہ جاتا ہے۔ اس کے اپنے کام میں مہارت اسے ذہنی اور معاشرتی خوبیوں کی قربانی دینے کے بعد حاصل ہوتی ہے۔"

الزام کو جاری رکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ کارخانے صرف مزدوروں سے ان کی آزادی اور دلچسپی ہی نہیں چھینتے بلکہ ان پر کام کی زیادتی کا ناقابلِ برداشت بوجھ بھی ڈالتے ہیں۔ نفع کی ہوس ان سے زیادہ گھنٹوں تک کام لیتی ہے۔ اس طرح مزدور کی طاقت جلد ختم ہو جاتی ہے، اور اسے پچاس سال کی عمر میں پرانی مشین کی طرح بے کار سمجھ کر نکال دیا جاتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سے اپاہج ہونے اور موت کا خطرہ کام میں ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ ہاتھ پیر بے کار ہونے کی صورت میں بہت تھوڑی رقم اس کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ جو اس کے لواحقین کے لیے مفلسی کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے بھی قابل نہیں ہوتی۔ صدہا مزدور کانوں، کارخانوں اور ریلوں میں کٹتا اور مرتا رہتا ہے۔ اس خطرہ کو کم کرنے میں اخراجات کی وجہ سے لیت و لعل برتی جاتی ہے۔ زندگی کو ایسی حقیر چیز سمجھا جاتا ہے کہ اس کے مقابلہ میں نفع کی کمی کو گوارا نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح کارخانوں کی حفظانِ صحت کی حالت بہت ابتر ہے۔ مارکس اپنی کتاب "Capital" میں لکھتا ہے:

"ہم یہاں اس مادی ماحول کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جس کے ماتحت کارخانوں میں کام لیا جاتا ہے۔ مصنوعی گرمی و سردی، خاک اور میل سے پُر فضا، کانوں کو سُن کرنے والا غل و شور۔ یہ تمام اسباب ایسے ہیں جو مزدوروں کے شعور و احساس کو زبردست نقصان

پہنچانے والے ہیں پیداوار دولت کے معاشرتی وعمرانی وسائل کی اقتصادیات گویا حوائج خانے میں پرورش پاکر سرمایہ کی گود میں کارخانے کے مزدوروں کی ضروریاتِ زندگی پر ڈاکہ ڈالنے والی بن جاتی ہے اور ان سے جگہ، روشنی، ہوا کے علاوہ دیگر خطرات سے بچانے والے ذرائع چھین لیتی ہے۔ آرام و آسائش کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ کارخانے کا کام نظام اعصاب کے لیے بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔ مزدور کے جسم اور پٹھوں کی دیگر ضروری حرکات، اور آزادی کا ذرہ ذرہ خواہ وہ جسمانی ہو یا ذہنی اس سے چھن جاتا ہے"

باوجود ان تمام سختیوں اور یک رنگی کے مزدور کو سب سے زیادہ ڈر اس بات کا ہوتا ہے کہ کہیں اس کی ملازمت نہ چھوٹ جائے۔ مفلسی سے زیادہ آئندہ فاقہ زدگی و مفلسی کا ڈر ہوتا ہے۔ عام بے روزگاری کے باعث اس کی پوزیشن غیر یقینی ہوتی ہے۔ مزدور جماعت کی پوزیشن موجودہ سوسائٹی میں ناقابل برداشت ہی نہیں ہے بلکہ قدیم طریق پیداوار دولت کے مقابلہ میں بھی ناقص ہے۔ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ اسے مزدوری کم ملتی ہے، بلکہ اس قلیل مزدوری کے ساتھ ایک غیر یقینی مستقبل پریشان کن ہے۔ کیونکہ اس کا دار و مدار اب اور بھی زیادہ سرمایہ داروں پر ہے۔ اور ہر وقت بیکاری کا خوف دامنگیر رہتا ہے۔

اس سخت اور پُر از خطرات زندگی بسر کرنے کے باوجود یہ دیکھنا ہے کہ مشترکہ پیداوار کی تقسیم کے وقت مزدور کے حصہ میں کیا آتا ہے۔ اس کی زندگی کی آسائش کے لیے کیا کیا سامان فراہم کیے جاتے ہیں۔ اس کے متعلق یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ مزدوروں کی اکثریت موجودہ نظام جماعت میں تمام عمر افلاس و تنگی میں بسر کرتی ہے جو دولت پیدا کی جاتی ہے، وہ نہایت بے انصافی سے تقسیم کی جاتی ہے۔ چند کے حصہ میں تو لاکھوں اور کروڑوں روپے کے علاوہ اپنے ساتھی انسانوں کی زندگی اور محنت پر لا محدود کنٹرول حاصل ہوتا ہے، بے حد و حساب عیش و عشرت ان کا پیدائشی حق

ہوتا ہے۔ اور اکثریت کے حصہ میں فاقہ و افلاس کے علاوہ ہر قسم کی تمدن اور اخلاق سے گری ہوئی زندگی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

"انگلستان میں آٹھ کروڑپتی اپنے عزیزوں کے لیے ایک سال میں اتنی دولت چھوڑ مرتے ہیں جو تقریباً ۶۶۴۰۰۰ غریبوں کی ایک سال کی وراثت کے برابر ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ چند کروڑپتیوں کی دولت تمام غریبوں کی دولت کے برابر ہے۔ انگلستان کی آبادی کا تقریباً ۱/۹ حصہ کل ملک کی آدھی دولت سے زیادہ کا مالک ہے۔

[Chiozza- Money- Riches & Poverty (صفحہ ۴۳-۵۲-۴۷)]

یہی حال امریکہ کا ہے۔ جہاں ذات پات اور خاندان کی آزادی اور ملک کی اتنی وسعت کے باوجود ایک کروڑ سے زائد انسان غربت و افلاس میں مبتلا ہیں۔

مزدور کی فرصت اور کام کے اوقات دونوں بُری طرح اور بُرے ماحول میں گذرتے ہیں مانچسٹر کے مزدوروں کی زندگی کی تصویر جو Engel نے اپنی کتاب Condition of the working Class in England in [illegible] میں کھینچی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس وقت کے مزدوروں کی حالت کس قدر قابلِ رحم اور ناگفتہ بہ تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ تقریباً ایک صدی قبل حفظانِ صحت کا اتنا خیال عام طور پر نہیں رکھا جاتا تھا۔ تو A.M. Simon کی کتاب "Packingtown" میں بیسویں صدی کے شکاگو کے ایک گوشے کی تصویر ملاحظہ کرلیں۔ یہ تصویر بھی ویسی ہی ہولناک ہے۔ ان حالات میں مزدوروں کی صحت کا قائم رہنا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں پورے طور پر آرام نہ ملنے اور آب و ہوا کے خراب ہونے کے سبب ان میں اموات کی تعداد کہیں زیادہ ہے۔ چنانچہ Hobson کہتا ہے: "اوسطاً ایک مزدور بہ نسبت ایک خوشحال متوسط طبقے کے آدمی کے پندرہ سال کم زندہ رہتا ہے" اس دولت کے

حاصل کرنے کی کشمکش کا اثر بے چارے بے بس و معصوم بچوں پر بھی پڑتا ہے۔ نظام سرمایہ داری میں بہت سے عیوب ہیں۔ لیکن ان میں سب سے زیادہ شرمناک گناہ چھوٹے بچوں کی اموات اور بیماری کی زیادتی ہے۔ جو اس کے نامۂ اعمال میں لکھا جا رہا ہے۔

اب یہ دیکھنا ہے کہ انڈسٹریل دور میں مقابلے کے دستور کا اخلاق پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے یہاں بھی سوشلزم سرمایہ داری کے سر یہ الزام تھوپتا ہے۔ چنانچہ Engels لکھتا ہے۔

"شرابخواری کے علاوہ انگریز مزدوروں کا بڑا قصور یہ ہے کہ وہ جنسی یا شہوانی تعلقات میں آزادی سے کام لیتے ہیں۔ لیکن یہ دونوں عادتیں ایسی جماعت میں جو اپنی آزادی کے صحیح استعمال سے ناواقف ہو اور اُس کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا گیا ہو، پیدا ہونی لازمی ہیں۔ متوسط طبقے نے مزدوروں کے پاس شراب اور شہوت رانی کی مسرتوں کے علاوہ اور باقی کیا چھوڑا ہے۔ سخت اور محنت کی زندگی کے بعد مزدور جماعت جب زندگی سے کچھ لطف اُٹھانا چاہتی ہے، تو اپنی تمام توجہ اور فرصت ان دونوں مسرتوں کے حاصل کرنے میں صرف کرتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عقل و بصیرت کی باگ ہاتھ سے کھو کر حد سے تجاوز کر جاتے ہیں"۔

ان کی زندگی کی یکرنگی انہیں جوئے اور شرابخوری کی طرف راغب کرتی ہے۔ مزدوری کی رقم ناکافی ہونے کے سبب جوان لڑکیوں کو سخت محنت کرکے اپنے جسم اور روح میں ربط قائم رکھنا پڑتا ہے Göhre اپنی کتاب Three Months in a Workshop (صفحہ ۲۰۲۔ ۲۰۳) میں لکھتا ہے:۔

"میرا خیال ہے کہ Chemnitz مقام کی کل مزدور جماعت میں ستر سال سے زائد عمر کا

لے یہ حالات یورپ کی مزدور جماعت سے متعلق ہیں، ہندوستان کے مزدوروں کی حالت اس سے کسی قدر مختلف ہو۔

لڑکا یا لڑکی با عصمت ملنا مشکل ہے۔ اخلاقی بدعنوانیاں آج کل کے نوجوانوں میں عام ہوگئی ہیں
کنبے یا خاندان کی زندگی ان میں مفقود ہے۔ تمام دن باپ گھر سے باہر رہتا ہے، اور کبھی کبھی ماں بھی کام پر جاتی ہے۔ عورت اپنی شادی محض سہارا ڈھونڈھنے کے لیے کرتی ہے۔ سب کے سب چھوٹے گھروں میں بلا امتیاز گڈمڈ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے موجودہ نظام میں مزدور کی خاندانی زندگی کا خاتمہ ہے۔ ایک بے آرام اور گندے گھر کی بدترین فضا میں بہت سے انسان یکجا ایک ہی گھر میں رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ میاں تمام دن باہر کام کرتا ہے۔ کبھی کبھی بیوی بھی کام پر جاتی ہے، بڑی عمر کے بچے بھی اپنے اپنے کام پر مختلف کارخانوں میں جاتے ہیں۔ صرف صبح و شام انہیں آپس میں مل کر بیٹھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور یہ لمحات بھی زیادہ تر شرابخوری میں گذرتے ہیں۔ ایسے حالات میں خاندانی زندگی کیسے ممکن ہے Engels بھی اس قسم کے واقعات کی تصدیق کرتا ہے May Walden Kerr اپنی کتاب "Socialism and the Home" کے صفحہ ۲۶ پر لکھتی ہیں :-

> امریکہ کے بڑے بڑے شہروں میں بڑی بڑی دکانوں پر نوجوان لڑکیوں کو صرف ساڑھے تین ڈالر فی ہفتہ تنخواہ ملتی ہے۔ اگر انہیں گھر پر ماں باپ کو کھانے کا کچھ بھی نہ دینا پڑے تب بھی اس میں ان کے کام پر آنے جانے کا کرایہ سواری اور حیثیت کے لباس کا بھی پورا نہیں پڑتا۔ بلکہ ان سے صاف طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر ان کی تنخواہ کم ہے تو وہ اپنے اوپر کے اخراجات دوسرے ذرائع و وسائل یعنی مردوں سے دوستی کرکے پورے کریں۔ اور ان میں سے اکثر ایسا کرنے پر مجبور ہوتی رہیں۔

ان تمام باتوں اور خرابیوں کے باوجود سوسائٹی خود اپنے نظام کی خرابی کو انہی مزدوروں کے سر تھوپتی ہے۔ اس بارے میں Sidney Webb لکھتا ہے :-

"ایسے حالات میں جبکہ ہم نے مزدوروں کو جکڑ رکھا ہے۔ اور عملاً ہر ایک کو اپنی حالت حقیقۃً بہتر بنانے کے مواقع سے محروم رکھنے کے علاوہ اس میں وہ بلند احساسات اور اعلیٰ جذبات ہمدردی جو ایک متمدن قوم میں ہونے چاہئیں، پیدا کرنے میں رکاوٹیں ڈال رکھی ہیں۔ اس کی زندگی کی مدت کو اپنی خدمت کی بدولت گھٹا دیا ہے۔ ذاتی ارتقاء سے اس کا تعلق منقطع کرکے بیماری اور مفلسی کے خوف کا شکار بنا رکھا ہے۔ اس کے بیوی بچے اس کی آنکھوں کے سامنے بیمار ہوتے ہیں اور موت کے گھاٹ اُتر جاتے ہیں۔ حالانکہ اس کی محنت ومشقت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ تب ہمیں اس کی حالت پر افسوس ہوتا ہے۔ اس کی اُمیدیں خاک میں مل جاتی ہیں، اور وہ اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے جوئے اور شراب کی پناہ لیتا ہے۔ افلاس کے سبب گناہ کی پھسلواں وخطرناک گھاٹی کی جانب رُخ کرکے ایسے چکّر میں پڑ جاتا ہے کہ اُس کے گناہ اس کی مفلسی اور زیادہ بڑھا دیتے ہیں اور مفلسی گناہ کی زیادتی کا سبب بنتی ہے۔ یہاں تک کہ سوسائٹی اس کو بدمعاش اور ذلیل تصور کرنے لگتی ہے اور ہم اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلّی دے لیتے ہیں کہ یہ اس کا اپنا ہی قصور ہے، اور اس کو بہتر بنانے کے لیے ہم کفایت شعاری، دور اندیشی، نیکی اور نشہ کی چیزوں سے پرہیز کرنے کا وعظ سناتے ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی محنت کا پھل کھانے کے لیے اس کو متواتر محنت کرنے کا سبق بھی دیتے ہیں۔ تاکہ ہمارے عیش میں فرق نہ آئے۔"

(English Progress Towards Democracy, Fabian Tract № 15 - صفحہ ،)

اس تقریر سے یہ ضرور ثابت ہوجاتا ہے کہ سوشلزم کی ترقی اور اُس کی مقبولیت کے اسباب کیا ہیں؟ اور وہ کن مقاصد کو لے کر وجود میں آیا ہے؟ لیکن اب تک یہ امر ثابت نہیں ہوسکا کہ سوشلزم ہماری معاشی واقتصادی مشکلات اور معاشرتی واجتماعی زبوں حالیوں کا کامیاب علاج ہے بھی یا نہیں؟